میرے منّے ماموں

بنتِ سید محمد وقار الحسن ہمدانی

جس گھڑی تیری یادوں کا سماں ہوتا ہے
پھر میسر ہمیں آرام کہاں ہوتا ہے

ماموں جان کا خیال ذہن میں آتے ہی یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گفتگو منظّم ہوتی ہی نہیں، تحریر مرتب ہوتی ہی نہیں۔ ذہن کسی ایک یاد کا کوئی سرا بمشکل قابو کرتا ہے کہ اک دم کوئی دوسری سہانی یاد اپنی گرفت میں لے لیتی ہے یعنی

ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ ''تفکر'' کا

اور پھر آنسو ایک جوئے بے کنار کی مانند رواں ہو جاتے ہیں۔ شخصیت کیا ہے ایک بحرِ بے انتہا ہے جو سمیٹے نہیں سمٹتا۔ ایک ایسی ہستی جس کی شخصیت ہمہ جہت ہے اور ہر پہلو اتنا وسیع اور جامع کہ اس کا احاطہ کئی ضخیم کتب شاید ہی کر سکیں۔

میں نے ہوش سنبھالی تو اُن کی آغوش میں اور پرورش پائی تو ان کے سایہ عاطفت میں۔ آنکھ کھولتے ہی میرے (ذہن پر) دل و دماغ پر ماموں جان کا نقش ایک انسان کا تھا جس کی زندگی دو ہی کاموں سے عبارت تھی علم دوستی اور محبتیں بانٹنا۔ گھر کا وہ گوشہ جو اُن کی قرار گاہ تھا اس کے لیے کمرے سے زیادہ لائبریری کا لفظ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ کتابیں آج بھی اسی ترتیب اور قرینے سے رکھی ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ ہر کتاب پر ان کے انمٹ نقوش ثبت ہیں۔ ان کتابوں کو دیکھتے ہوئے آنکھیں چھلک پڑتی ہیں ان کو چھوتے ہوئے ہاتھ لرز اٹھتے ہیں

یقیں ہی نہیں آتا ہمیں بچھڑنے کا
مہک رہا ہے جا بجا کوئی

میں تقریباً پانچ سال کی تھی جب مجھ سے چھوٹی خالہ جان نے استفسار کیا کہ آپ کو ماموں جان کیسے لگتے ہیں تو میں نے چہک کر جواباً کہا:

''میرے منے ماموں تو گلدستہ ہیں''

ہاں! وہ گلہائے صد رنگ کا ایک حسین مجموعہ ہی تو تھے۔ ایک ایسا مجموعہ جس کی نہ صرف خوشبو بے مثال تھی بلکہ وہ رنگینی میں بھی اپنی مثال آپ تھا تو گلدستہ خوشبوئیں بکھیر رہا تھا، ماحول روشن ہیں نہیں معطر بھی تھا، گلشن کی رونق قابلِ دید تھی، بہار اپنے جوبن پر تھی۔ زندگی کے سبھی رنگ، سبھی روشن رنگ اس ایک ذات میں منعکس تھے۔ گلدستہ کچھ ایسا جاذبِ نظر تھا کہ ہر ذی بصیرت دیکھتے ہی کھو سا جاتا، ماسوا کو بھول ہی تو جاتا۔ شعبہ ہائے زندگی کا کون سا پہلو ایسا ہے جو ان کی چشمِ رسا سے اوجھل

رہا ہو اور جہاں علم کے اس شناور کی پہنچ نہ ہو۔

میرے حافظے میں ان سے متعلق جتنے نقش ہیں سبھی دمکتے تاروں اور مہکتے گلابوں جیسے ہیں۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی ان کے کسی قول و فعل سے کسی چہرے پر دکھ کی کوئی پرچھائیں نمودار ہوئی ہو۔ جس محفل میں وہ موجود ہوتے، اداسی اور مایوسی اس کی راہ بھول جاتی۔ وہ انجمن مسرتوں کا گہوارہ اور اجالوں کا مسکن بن جاتی۔ گزشتہ برس گرمیوں میں ملتان آئے ہوئے تھے۔ جمعہ کے روز گھر میں محفل جمی تھی۔ ہماری ایک عزیزہ نے اپنی جواں سال بیٹی کی طویل علالت کا ذکر کیا اس پر انھیں مختلف اطباء کی طرف توجہ دلائی۔ دوران گفتگو وہ خاتون آبدیدہ ہوگئیں تو ماموں جان نے اچانک اندازِ گفتگو بدلتے ہوئے ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے کہ کوئی عقیدت مند ایک بزرگ کے پاس آیا اور نہایت شرح وبسط سے نجی پریشانیوں کا ذکر شروع کر دیا۔ دورانِ گفتگو وہ ضبط کھو بیٹھتا اور بے طرح رونے لگتا۔ بزرگ نہایت خاموشی سے اس کی روداد سنتے رہے۔ جب وہ اپنی تشفی کر چکا تو انھوں نے فرمایا کہ اب بس تم صرف ایک کام کرو اور وہ یہ کہ جس طرح تم نے مجھے اپنی بپتا سنائی ہے اور جیسے میرے سامنے تم پر گریہ طاری ہوا ہے اتنا ہی وقت لگا کر، اسی کیفیت سے اور کم از کم اتنے ہی استحضار سے یہ سب کچھ اپنے رب سے ہر روز کہا کرو۔ پھر دیکھو تمھاری پریشانیاں کیسے عنقا ہوتی ہیں۔

میدانِ علم و ادب کے سب معتبر نام ان کے حلقۂ احباب کے نمایاں ارکان میں سے تھے۔ ہم بچوں کی تعلیمی مراحل میں کامیابی پر بہت زیادہ حوصلہ افزائی کرتے اور ہر ممکن مدد کرتے۔ وہ ہم میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے خواہش مند تھے۔ غالباً ۲۰۰۵ء میں، میں نے ان سے ایک ادبی واقعے کی تحقیق کرنے کے لیے فون پر رابطہ کیا۔ ان دنوں املج (سعودی عرب) میں مقیم تھے۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے، مکمل واقعہ بتایا، دعائیں دیں اور بعد ازاں بھائی جان کے نام خط میں میرا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ یہ ان کا بچوں میں اعتماد، اور باہمی ربط پیدا کرنے کا ایک انداز تھا۔ آخری بار جب پاکستان آئے ہیں تو رمضان المبارک کی ایک شام اچانک میری امی سے پوچھا ''میشی کدھر ہے؟'' میں آواز سن کر گئی تو کہنے لگے کہ اصل میں ایک لطیفہ یاد آیا تھا میں نے کہا آپ کو سنا دوں قبل اس کے کہ حافظے سے محو ہو جائے۔ سرائیکی زبان میں میری دلچسپی کو محسوس کیا تو خبریں کا سرائیکی صفحہ مجھے خصوصیت سے دکھاتے پھر مختلف چیزوں پر میری رائے طلب کرتے اور اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ لفظوں سے میری جس قدر شناسائی ہے انھی کی عنایتوں کی مرہون منت ہے۔ میں نے انگریزی ادب پڑھنا شروع کیا تو اپنی انگریزی کی سبھی کتابیں میرے سامنے رکھ دیں۔ کالج سے واپس آ کر سلام کرتے ہیں پہلے The Dawn مجھے تھماتے اور پھر کچھ اور کرتے۔ الغرض ان کے احسانات اور ان کی شفقتیں بے شمار ہیں۔ فیاضی اور رہنمائی کا یہ سلسلہ محدود نہ تھا۔ ہر کس و ناکس ان سے جس قسم کا فائدہ حاصل کر لینا چاہتا، بآسانی کر لیتا۔ محبت اور احسان یہ دونوں کام وہ ہمیشہ صلے کی امید اور پروا کے بغیر کرتے۔ یہ بات اس اعلیٰ ظرف اور وسیع النظر انسان کی سرشت میں ہی نہیں تھی کہ بھلا چاہنے اور بھلا کرنے کے لیے دوست اور دشمن کا فرق روا رکھا جائے۔ ماموں جان انتہا درجے کے مہمان نواز تھے۔ ان کا دسترخوان بڑا کشادہ تھا۔ اس پر ہر مکتب فکر کے لوگ جمع ہوتے۔ وہ دوسروں کو کھلا کر، اوروں کو خوش کر کے، بے حد مطمئن اور سرشار ہوتے۔

محبتیں نچھاور کرنے کا یہ سلسلہ رواں دواں تھا، میدان علم و ادب میں چراغ سے چراغ روشن کرنے کا عمل برق رفتاری سے جاری تھا، گلشن میں ہر سو اسی گلاب کی خوبصورتی اور سحر انگیزی کا چرچا تھا کہ یکا یک منظر بدل گیا۔ باغباں گلچیں کی نظر اس گلاب پر جا ٹھہری۔ خوشبو سے لبریز بادِ صبا کا ایک جھونکا آیا اور پھول کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کے اردگرد نور کا ایک

ہالہ سا بن گیا۔ انگشتِ شہادت آسماں کی جانب اٹھی اور دمِ واپسیں ایک واضح آواز سنائی دی اشھد ان لاالہ الااللہ .....

اور یوں چند ہی لمحوں میں وہ پھول باغِ عدن کی زینت بن گیا۔ مالک کے فیصلے تو کبھی بھی حکمتوں سے خالی نہیں ہوتے۔ تو مالک نے اپنی ان حکمتوں کے مطابق جو انسانی عقل کی دسترس میں نہیں اس کو باغِ بہشت کے لیے منتخب کر لیا۔

اس پھول کی جدائی سے گلشن پہ کیا گزری۔ قیامت ہی تو ٹوٹ پڑی، عین شباب میں گلشن پر زوال آ گیا، نکھرے ہوئے روشن رنگ پھیکے پڑ گئے، مرغانِ خوشنوا اپنے زمزموں کی دھنیں تراشنا بھول گئے، بہاریں روٹھ گئیں، مسرتیں کوچ کر گئیں، خزاں نے ڈیرا ڈال لیا، عین ہنگامِ طرب میں سارے منظر بے ترتیب ہو گئے۔ وہ جگہیں جہاں کبھی محفلیں جما کرتی تھیں آج ان کی ویرانی بیاں سے باہر ہے۔ میرے ماموں جان کا وہ کمرہ جہاں جاتے ہی اداس ترین لمحات میں بھی غم کے سارے بادل چھٹ جایا کرتے تھے، ہمہ قسم کی پریشانیاں غائب ہو جاتی تھیں اب وہاں اداسیوں نے قبضہ جما لیا ہے۔ آج وہاں پر صرف ان کی دو ننھی کلیوں کی کھوجتی نگاہیں ہیں، معصوم سوالات ہیں۔ اگر بابا قیامت والے دن ملیں گے تو قیامت کب آئے گی؟ بابا فون کیوں نہیں کرتے؟ اور اس جیسے ڈھیروں سوالات جن کا جواب دینا دل گردے کا کام ہے۔ وہ کلیاں چٹکنا بھول گئی ہیں۔ ہنستے مسکراتے عطاء المکرّم اور عطاء المنعم کی سبھی شرارتیں ختم اور سبھی مسکراہٹیں غائب ہو گئی ہیں۔ ان کے اجلے چہروں کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔ فلسفۂ موت و حیات سے بے خبر، وہ دنوں بھی آپ کا انتظار کرتے ہیں۔

ماموں جان! آپ کے اس طرح چلے جانے پر حواس مختل ہیں۔ صدمات کا دل سوز ہونا سنتے تھے اب دیکھ بھی لیا۔ للہ درّ قائل

لولا مفارقة الاحباب ما وجدت
للمنا یا الی ارواحنا سبلا

لفظ گم ہو گئے ہیں۔ کوئی استعارہ، کوئی کنایہ ساتھ دینے کو تیار نہیں۔ الفاظ تو تعبیر کی ادنیٰ ترین کوشش ہیں۔ کربناک لمحے لفظوں میں بیاں ہوا بھی کب کرتے ہیں۔ بس ان جیسی قد آور شخصیت کے بعد ہم ایسے بونے بالکل ہی بے قیمت ہو کر رہ گئے ہیں۔ ماموں جان نے خود تو کہہ دیا تھا.....

کردار　　باقی　　رہ　　گئے
بے　　کار　　باقی　　رہ　　گئے